ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.8,Issue No.2 (2026)
(April to June)

اُردو ادب میں یوٹوپیائی عناصر

Utopian Elements in Urdu Literature

عرفان علی

پی ایچ۔ڈی اسکالر، شعبہ اُردو، کلیہ زبان اوادب مائی یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر سمیرا لیاقت

لیکچرار، شعبہ اُردو، وفاقی اُردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس اور ٹیکنالوجی، اسلام آباد

Irfan Ali

Ph.D. Scholar, Faculty of Languages and Literature, My University, Islamabad

Dr. Sumaira Liaqat

Lecture, Department of Urdu, The Federal Urdu University of Arts, Science & Technology

Article Details

Received:
May 28, 2026

Accepted:
June 6, 2026

Online Published:
June 30, 2026

Copyright: © 2023 by the authors. This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract: There is a particular kind of dreaming that refuses to stay quiet. It does not announce itself with banners or manifestos. This is the utopia of Urdu literature and it has been alive for centuries. This paper sets out to explore how the idea of a better world has woven itself through the entire fabric of Urdu literary tradition, it is something deeper: that Urdu literature developed its own distinct language of hope, one that does not resemble the Western utopian tradition in either form or feeling. Urdu writers never looked for utopia on any map. The paper moves through the major genres of Urdu literature with this lens. In the ghazal, it finds a utopia that is intensely personal the eternal beloved who is never reached, whose very unreachability is what gives life its meaning Moving into fiction, the paper traces how the Urdu novel carried utopia through its most complicated terrain. Deputy Nazir Ahmad dreamed of a morally reformed household.

Key words: Urdu Literature, Utopia, Dystopia, Classical Poetry, Progressive Writers Movement, Ghazal, Marsiya, Dastan, Partition Literature.

ادب ہمیشہ صرف موجودہ دنیا کی عکاسی نہیں کرتا بلکہ ایک ایسی دنیا کا تصور بھی پیش کرتا ہے جو ابھی وجود میں نہیں آئی۔ اسی تصور کو مغربی ادبی روایت میں "یوٹوپیا" (Utopia) کہا جاتا ہے۔ لفظ یوٹوپیا پہلی بار سولہویں صدی میں انگریز مفکر تھامس مور نے اپنی کتاب Utopia (1516) میں استعمال کیا، جہاں ایک مثالی معاشرے کا خاکہ پیش کیا گیا تھا۔ ایک ایسے خیالی جزیرے کی کہانی جہاں سب برابر ہیں، جہاں غربت نہیں، جہاں ظلم نہیں ۔ بعد ازاں یوٹوپیائی ادب نے مختلف شکلیں اختیار کیں۔ اُردو ادب کے شاعروں، افسانہ نگاروں اور ناول نویسوں نے صدیوں سے ایک مثالی دنیا کا خواب دیکھا ہے۔ کبھی انقلاب کی زبان میں، کبھی عشق کی علامت میں، اور کبھی سماجی اصلاح کی آواز میں۔ مگر اُردو ادب نے یوٹوپیا کو کبھی کسی جزیرے میں نہیں ڈھونڈا۔ اُردو کا یوٹوپیا کسی نقشے پر

نہیں ملتا۔ یہ ایک غزل کے مطلع میں چھپا ہوتا ہے، کسی افسانے کے آخری جملے میں سانس لیتا ہے، کسی ناول کے کردار کی آنکھوں میں ٹھہرا ہوتا ہے۔ مغرب نے جو خواب فلسفے کی زبان میں بیان کیا، اُردو نے وہی خواب جذبے کی زبان میں کہا اور شاید اسی لیے وہ زیادہ سچا لگتا ہے، زیادہ قریب محسوس ہوتا ہے۔

انسان نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھتا آیا ہے جو اس کے سامنے موجود دنیا سے بہتر ہو۔ یہ خواب کسی ایک قوم یا زبان کا نہیں۔ اُردو ادب میں یوٹوپیا نہ تو کوئی کتابی تصور ہے اور نہ ہی یہ کوئی فلسفیانہ اصطلاح ہے یہ تو ایک تخلیق کار جس نے کوئی ظلم دیکھا ہو اس کے قلم کا نتیجہ ہے۔ اس تخلیق کار نے معاشرے کے اندر موجود ناانصافیوں کو اپنے لفظوں میں ڈھالا۔ جب فیض نے کہا:

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دن کہ جس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھا ہے (۱)

انھوں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ اُنھوں نے ایک دنیا کا نقشہ کھینچا تھا، ایک ایسی دنیا کا جو ابھی آئی نہیں تھی مگر جس کا آنا ناگزیر تھا۔ فیض نے یہ شعر ضیاء الحق کے دور میں لکھا، جب شاعری پر پابندی تھی، جب امید رکھنا بھی جرأت کا کام تھا۔ مگر فیض نے کہا "ہم دیکھیں گے" یہ صرف ایک وعدہ نہیں تھا، یہ ایک اعلان تھا کہ خواب کو مارا نہیں جا سکتا۔ یہی اُردو ادب کا یوٹوپیا ہے۔ جو ہے نہیں، مگر ہونا چاہیے، جو دکھتا نہیں، مگر محسوس ہوتا ہے، جو ملتا نہیں، مگر جس کی تلاش ہر بڑے قلمکار کی روح میں دھڑکتی رہی ہے۔

اُردو ادب میں یوٹوپیائی عناصر تلاش کرتے ایک بات سامنے آتی ہے جو شاید سب سے اہم ہے۔ اُردو زبان خود ایک یوٹوپیا ہے۔ یہ زبان کسی ایک قوم کی نہیں تھی۔ یہ فارسی سے آئی، عربی سے آئی، ترکی سے آئی، ہندی سے آئی، برج بھاشا سے آئی اور ان سب کو ملا کر ایک ایسی زبان بنی جو کسی کی بھی تھی اور سب کی بھی تھی۔ یہ زبان دہلی کے بازاروں میں پلی، لکھنؤ کے دربار میں سنواری، دکن کی فضاؤں میں مہکی، اور پھر پورے برصغیر کی زبان بن گئی۔ کیا یہ یوٹوپیا نہیں؟ ایک ایسی زبان جو سرحدیں نہیں مانتی، جو مذہب نہیں دیکھتی، جو طبقہ نہیں پوچھتی بس بولنے والے کا دل دیکھتی ہے۔ جب ہم اُردو میں لکھتے ہیں تو ہم صرف الفاظ نہیں لکھتے۔ ہم اس خواب کو زندہ رکھتے ہیں کہ مختلف لوگ مل کر کچھ خوبصورت بنا سکتے ہیں۔ اُردو زبان کا وجود خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یوٹوپیا ممکن ہے کیونکہ یہ زبان خود ایک یوٹوپیائی تجربے کا نتیجہ ہے۔ اُردو میں یوٹوپیائی سوچ کا اظہار ہمیشہ براہِ راست نہیں ہوا۔ یہاں خواب کو خواب نہیں کہتے، اسے "وصل کی رات" کہتے ہیں، اسے "انقلاب کی صبح" کہتے ہیں، اسے "کھوئی ہوئی جنت" کہتے ہیں۔ علامتیں، استعارے، کنایے۔ یہ اُردو ادیب کے وہ ہتھیار ہیں جن سے اس نے ایک بہتر دنیا کا نقشہ کھینچا، بغیر یہ کہے کہ وہ نقشہ کھینچ رہا ہے۔ اُردو کلاسیکی شاعری بظاہر عشق و محبت کی شاعری ہے مگر غور سے پڑھیں تو اس کے ہر شعر میں ایک مثالی دنیا کی تڑپ ہے۔

اُردو کلاسیکی شاعری میں یوٹوپیا کوئی اعلانیہ نعرہ نہیں بنا، بلکہ وہ غزل کے مصرعوں میں، قصیدے کی تمنا میں، اور مثنوی کی فضا میں خاموشی سے سانس لیتا رہا۔ میر تقی میر جب درد اور محرومی کی بات کرتے ہیں تو وہ محض رونے کی شاعری نہیں کرتے۔ ان کے ہر شعر میں ایک الٹا احتجاج ہے، ایک ایسے معاشرے کی خواہش جہاں انسان کی تذلیل نہ ہو میر کہتے ہیں:

ہستی　اپنی　حباب　کی　سی　ہے
یہ　نمائش　سراب　کی　سی　ہے　(۲)

یہ شعر بظاہر فنا کی بات کرتا ہے، مگر گہرائی میں یہ اس دنیا کو رد کرتا ہے جو انسان کو بے وقعت سمجھتی ہے اور یہی رد، یوٹوپیائی سوچ کی پہلی سیڑھی ہے۔ میر تقی میر کا درد محض ذاتی نہیں تھا۔ وہ ایک ایسے شہر میں رہتے تھے جو ٹوٹ رہا تھا، ایک ایسی تہذیب کے گواہ تھے جو بکھر رہی تھی۔ ان کی شاعری میں جو آہ ہے، وہ دراصل ایک ایسی دنیا کی طلب ہے جہاں انسانی جذبے کی قدر ہو۔ غالب کا معاملہ اس سے بھی گہرا ہے۔ غالب نے وہ سوال پوچھے جو اس دور میں پوچھنا خطرناک تھا۔ اُنھوں نے خدا سے بھی بحث کی، زاہد سے بھی، اور اپنے آپ سے بھی۔ ان کا یوٹوپیا ایک ایسی کائنات ہے جہاں سوچنا جرم نہ ہو، جہاں عقل کو زنجیریں نہ پہنائی جائیں، جہاں انسان اپنی پوری آزادی کے ساتھ جی سکے۔ غالب کا باغیانہ لہجہ دراصل ایک آزاد فکر کی مثالی دنیا کا مطالبہ ہے، ڈھکے چھپے الفاظ میں، مگر بالکل واضح ارادے کے ساتھ۔

علامہ اقبال کو اُردو ادب کا سب سے بڑا یوٹوپیائی شاعر مانا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے خواب کو چھپایا نہیں، اُنھوں نے اسے "شاہین" کا نام دیا، "خودی" کا نام دیا، "مردِ مومن" کا نام دیا۔ اقبال کا یوٹوپیا صرف ایک مثالی ریاست نہیں۔ یہ ایک مثالی انسان کا خواب ہے۔ وہ انسان جو اپنی صلاحیتوں کو پہچانے، جو ظلم کے سامنے نہ جھکے، جو اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو واپس لائے۔ "جنتِ گمشدہ" کا تصور ان کی پوری شاعری میں ایک دھڑکن کی طرح موجود ہے۔ ایک یاد دہانی کہ ہم جہاں ہیں، وہاں نہیں رہنا، ہمیں آگے جانا ہے۔ اقبال کے یوٹوپیائی تصور پر الگ سے بات کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ اُردو ادب کے سب سے منظم اور سب سے وسیع یوٹوپیائی خواب دیکھنے والے شاعر ہیں۔

اُٹھو　مری　دُنیا　کے　غریبوں　کو　جگا　دو
کاخِ　امرا　کے　درو　دیوار　ہلا　دو(۳)

ایک ایسی دنیا کا خواب جہاں غریبوں کو انصاف ملے اور امرا کی اجارہ داری ٹوٹ جائے۔ یہی یوٹوپیا کا اُردو شاعری میں بہترین اظہار ہے۔ اقبال کا یوٹوپیا کئی سطحوں پر کام کرتا ہے۔ پہلی سطح فرد کی ہے۔ اقبال چاہتے ہیں کہ ہر انسان اپنی خودی کو پہچانے، اپنی صلاحیتوں کو جانے، اپنے اندر چھپی طاقت کو جگائے۔ ان کا "شاہین" وہ انسان ہے جو آسمانوں میں اڑتا ہے، جو پرانی لکیروں پر نہیں چلتا، جو اپنا راستہ خود بناتا ہے۔ دوسری سطح سماج کی ہے۔ ان کا "مردِ مومن" صرف عبادت گزار نہیں۔ وہ سماجی انصاف کا علمبردار بھی ہے۔ تیسری سطح تہذیب کی ہے۔ اقبال مغربی تہذیب کی مادیت پرستی کے خلاف ایک ایسی تہذیب کا خواب دیکھتے ہیں جو روح اور مادے میں توازن رکھے، جو ترقی کرے مگر انسانیت نہ کھوئے۔ اور چوتھی سطح کائناتی ہے۔ اقبال کا آخری خواب یہ ہے کہ انسان خدا کا نائب بنے — اس کائنات میں خدا کے خلیفہ کا کردار ادا کرے، اسے سنوارے، اسے بہتر بنائے۔ یہ سب سے بڑا یوٹوپیا ہے۔ اقبال کے یوٹوپیا میں خواب کے ساتھ راستہ بھی ہے، خودی، عشق، عمل، اور پھر نتیجہ۔ وہ صرف دنیا کا خواب نہیں دکھاتے، وہ اس دنیا تک پہنچنے کا نقشہ بھی دیتے ہیں۔

اگر کلاسیکی شاعری نے یوٹوپیا کو آسمانوں میں تلاش کیا، تو ترقی پسند تحریک نے اسے زمین پر اتار لایا۔ یہ وہ دور تھا جب دنیا بدل رہی تھی، جب انقلاب کی آوازیں ہوا میں تھیں، جب ادیبوں نے فیصلہ کیا کہ قلم صرف دل بہلانے کے لیے نہیں، بلکہ دنیا بدلنے کے لیے ہے۔ فیض احمد فیض کی شاعری ترقی پسند یوٹوپیا کا سب سے روشن چراغ ہے۔ ان کا خواب ایک ایسی دنیا کا تھا جہاں محنت کش کو

اس کا حق ملے، جہاں محبت کرنے والوں کو سزا نہ دی جائے، جہاں صبح کا اجالا صرف امیروں کے گھروں تک محدود نہ رہے۔ فیض نے جیل کی کوٹھڑی میں بیٹھ کر بھی اس خواب کو نہیں چھوڑا کیوں کہ جو خواب روح میں اتر جائے، اسے زنجیریں نہیں توڑ سکتیں۔ غزل اُردو ادب کی سب سے مقبول صنف ہے اور شاید سب سے زیادہ یوٹوپیائی بھی۔ غزل میں جو محبوب ہے، وہ کوئی حقیقی انسان نہیں — وہ ایک خواب ہے، ایک آدرش ہے، ایک ایسی ہستی ہے جو کامل ہے، بے عیب ہے، جو ملتی نہیں مگر جس کی تلاش زندگی کو معنی دیتی ہے۔ غزل کا عاشق ہمیشہ ناکام ہے — مگر وہ تلاش نہیں چھوڑتا۔ یہی یوٹوپیائی روح ہے۔ جو مل جائے وہ یوٹوپیا نہیں رہتا۔ یوٹوپیا وہ ہے جو ابھی نہیں ملا، مگر جس کی طرف چلتے رہنا ہے۔ غالب نے کہا تھا۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو(۴)

ایسی جگہ کی تلاش ہے جہاں دنیا کا شور نہ ہو، جہاں صرف اپنی روح کی آواز سنائی دے۔ یہ داخلی یوٹوپیا ہے، سب سے گہرا، سب سے ذاتی۔ غزل نے اُردو ادب کو یہ دیا کہ یوٹوپیا صرف سماجی نہیں ہوتا یہ انتہائی ذاتی بھی ہو سکتا ہے۔ ہر انسان کے اندر ایک ایسی جگہ ہے جہاں وہ جانا چاہتا ہے۔ ایک ایسی کیفیت جو اسے مکمل کر دے۔ غزل اسی کیفیت کا نام ہے۔

اُردو ادب کی ایک اور اہم صنف جسے یوٹوپیائی تناظر میں کم دیکھا جاتا ہے وہ مرثیہ ہے۔ مرثیہ بظاہر غم کی صنف ہے۔ کربلا کا واقعہ، شہادت کا درد، بچھڑنے کی تکلیف۔ مگر مرثیے میں ایک اور پرت ہے جسے غور سے دیکھنا پڑتا ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیوں میں جو کردار ہیں۔ حضرت عباس، حضرت علی اکبر، خود امام حسین، یہ سب مثالی انسان کی تصویریں ہیں۔ ایسا انسان جو ظلم کے سامنے نہیں جھکتا، جو اپنی جان دے دیتا ہے مگر اپنا ضمیر نہیں بیچتا، جو اکیلا ہو کر بھی پوری دنیا کے سامنے کھڑا رہتا ہے۔ یہ مثالی انسان یوٹوپیائی تصور ہے۔ مرثیہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ایسا انسان ممکن ہے، ہوا ہے اور اگر ایک بار ہوا ہے تو دوبارہ بھی ہو سکتا ہے۔ مرثیے میں غم اور یوٹوپیا ساتھ چلتے ہیں۔ ہم روتے ہیں کہ وہ دنیا چھن گئی جہاں ایسے انسان تھے اور ساتھ ہی دل میں ایک چاہت جاگتی ہے کہ کاش ہم بھی ایسے ہوں، کاش ہماری دنیا بھی ایسی ہو۔

شاعری میں یوٹوپیا ایک لمحے میں جنم لیتا ہے، ایک مصرعے میں، ایک استعارے میں۔ مگر ناول اور افسانے کا کینوس وسیع ہوتا ہے۔ یہاں یوٹوپیا کو پوری زندگی کے ساتھ جینا پڑتا ہے، کرداروں کے خوابوں میں سانس لینا پڑتا ہے، اور اکثر اوقات ٹوٹتے ہوئے دیکھنا پڑتا ہے۔ اُردو ناول اور افسانے نے یوٹوپیا کو اسی طرح برتا، نہ صرف خواب کے طور پر، بلکہ اس خواب کے پورا ہونے اور بکھرنے کی پوری داستان کے طور پر۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اُردو نثر کا یوٹوپیائی تجربہ شاعری سے زیادہ گہرا، زیادہ پیچیدہ، اور زیادہ انسانی ہے۔

اُردو ناول کی ابتدا ہی اصلاحی یوٹوپیا سے ہوئی۔ ڈپٹی نذیر احمد نے انیسویں صدی میں جو ناول لکھے "مراۃ العروس"، "توبۃ النصوح"، "ابن الوقت ان میں ایک مثالی مسلمان معاشرے کا خاکہ تھا۔ ان کا یوٹوپیا اخلاقی تھا، ایسا گھر جہاں عورت تعلیم یافتہ ہو، مرد ذمہ دار ہو، بچے دین اور دنیا دونوں سے آراستہ ہوں۔ یہ خواب محدود ضرور تھا، مگر اپنے عہد کے لیے انقلابی بھی تھا۔ کیونکہ نذیر احمد نے پہلی بار اُردو نثر کو یہ کام سونپا کہ وہ صرف کہانی نہ سنائے، بلکہ ایک بہتر معاشرے کا نقشہ بھی پیش کرے مگر جیسے جیسے اُردو ناول پختہ ہوتا گیا، یوٹوپیا بھی پیچیدہ ہوتا گیا۔ عبداللہ حسین کا ناول اداس نسلیں اُردو ادب کی سب سے دردناک یوٹوپیائی کہانیوں میں سے ایک ہے۔ مگر یہاں یوٹوپیا موجود نہیں، بلکہ گم ہو چکا ہے۔ ناول کے کردار آزادی کا خواب لے کر چلتے ہیں، تحریکِ آزادی میں جان لگاتے ہیں، مگر جب

آزادی ملتی ہے تو وہ خواب جو سینے میں تھا، حقیقت سے میل نہیں کھاتا۔ نعیم، ناول کا مرکزی کردار، اس کھوئے ہوئے یوٹوپیا کی علامت ہے۔

اُردو ناول نے یوٹوپیا کو ایک اور زاویے سے دیکھا۔ ماضی کی عظمت کے آئینے میں۔ یہاں یوٹوپیا آگے نہیں، پیچھے ہے۔ ایک کھوئی ہوئی دنیا جو کبھی تھی اور جسے واپس لانا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا "آگ کا دریا" اس کی سب سے بڑی مثال ہے۔ صدیوں کا سفر، تہذیبوں کا اتار چڑھاؤ، اور ہر موڑ پر یہ احساس کہ کچھ کھو گیا جو واپس نہیں آئے گا۔ قرۃ العین کا یوٹوپیا ایک ایسی مشترکہ تہذیب ہے جہاں ہندو اور مسلمان، شاعر اور فنکار، سب مل کر ایک خوبصورت دنیا بناتے تھے—اور جسے تقسیم نے چھین لیا۔ انتظار حسین کے ہاں یہ کھوئی ہوئی دنیا اور بھی گہری ہے۔ ان کی کہانیوں میں ایک ایسا شہر ہے جو شاید کبھی تھا، شاید خواب تھا مگر جس کی یاد اتنی تیز ہے کہ حقیقت پھیکی لگتی ہے۔ انتظار حسین کا یوٹوپیا حافظے میں زندہ ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ جو حافظے میں ہو، وہ مرتا نہیں۔

اُردو ادب میں مردوں کے یوٹوپیا اور عورتوں کے یوٹوپیا میں ایک بنیادی فرق ہے۔ مردوں نے انقلاب لانے چاہے۔ عورتوں نے ان گھر کے اندر ایک بہتر دنیا مانگی جہاں انہیں رہنا تھا۔ پروین شاکر کی شاعری میں یوٹوپیا بہت ذاتی ہے۔ مگر یہی ذاتی یوٹوپیا لاکھوں عورتوں کی آواز بن گیا۔ عصمت چغتائی نے وہ باتیں کہیں جو کہنا اس دور میں جرأت کا کام تھا۔ اُنھوں نے عورت کو اس کی پوری انسانیت کے ساتھ دیکھا۔ کمزوریوں کے ساتھ، خواہشوں کے ساتھ، غلطیوں کے ساتھ۔ ان کا یوٹوپیا ایک ایسا سماج ہے جہاں عورت کو دیوی یا شیطان نہ بنایا جائے بس انسان سمجھا جائے۔

اُردو ادب میں عورت کی آواز اور یوٹوپیا کا رشتہ اتنا گہرا اور اتنا پیچیدہ ہے کہ اس پر الگ سے لکھنا ضروری ہے۔ عورت نے اُردو ادب میں جو یوٹوپیا مانگا ہے، وہ مرد کے یوٹوپیا سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ مرد کا یوٹوپیا اکثر باہر کی دنیا میں تھا۔ انقلاب، ریاست، معاشرہ۔ عورت کا یوٹوپیا پہلے گھر کے اندر تھا۔ ایک ایسی جگہ جہاں وہ سانس لے سکے، جہاں اس کی بات سنی جائے، جہاں اس کا وجود قبول کیا جائے۔ واجدہ تبسم کے افسانوں میں ایک ایسی عورت ہے جو خاموش نہیں رہتی جو اپنا درد بیان کرتی ہے، اپنا غصہ ظاہر کرتی ہے، اپنی خواہشات کا اعتراف کرتی ہے۔ یہ اپنے دور میں انقلابی تھا اور یہ یوٹوپیائی بھی تھا کیونکہ ایسی عورت حقیقت میں بہت کم تھی، مگر ادب میں وہ زندہ تھی اور اپنی شرطوں پر زندہ تھی۔ زہرہ نگاہ کی شاعری میں ایک ایسی دنیا ہے جہاں عورت کے جذبات کو نام دیا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے وہ باتیں کہیں جو عورتیں محسوس کرتی تھیں مگر زبان پر نہیں آتی تھیں—اور اس طرح اُنھوں نے لاکھوں خاموش عورتوں کو ایک آواز دی۔ کشور ناہید نے ایک ایسی دنیا کا مطالبہ کیا جہاں عورت کو اس کے جسم سے الگ کر کے دیکھا جائے جہاں وہ صرف بیٹی، بیوی، ماں نہ ہو بلکہ ایک مکمل انسان ہو۔ ان کی نظم "ہم گناہگار عورتیں" صرف ایک احتجاج نہیں یہ ایک نئی دنیا کا اعلان ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں میں وہ کردار ہیں جو معاشرے کے حاشیے پر کھڑے ہیں غریب، مزدور، کسان۔ مگر ان کرداروں کے اندر ایک ایسی دنیا کی آرزو ہے جہاں وہ بھی انسان کی طرح جی سکیں۔ کرشن چندر کا یوٹوپیا بہت سادہ ہے، دو وقت کی روٹی، ایک چھت، اور اتنی عزت کہ کوئی انہیں کچل نہ سکے۔

سعادت حسن منٹو کا یوٹوپیا سب سے انوکھا ہے۔ منٹو نے کبھی خواب نہیں دکھایا۔ اس نے ڈراؤنی حقیقت دکھائی۔ مگر اس کی ہر کہانی کے پیچھے ایک چیخ ہے، ایک احتجاج ہے۔ یہ دنیا ایسی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ منٹو کا یوٹوپیا الٹا چلتا ہے، وہ ڈسٹوپیا دکھا کر یوٹوپیا کی ضرورت محسوس کراتا ہے۔ "ٹوبہ ٹیک سنگھ" پڑھیں تو سمجھ آتا ہے کہ وہ پاگل نہیں جو سرحدوں کے درمیان زمین پر گر کر مر گیا۔ پاگل وہ دنیا ہے جس نے سرحدیں کھینچیں۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ یوٹوپیا اور ڈسٹوپیا یہاں کبھی الگ نہیں رہے۔ مغربی ادب میں یوٹوپیا اور

ڈسٹوپیا دو مختلف صنفیں ہیں، دو الگ الگ راستے۔ مگر اُردو ادب میں یہ دونوں ایک ہی سانس میں چلتے ہیں۔ جہاں ڈسٹوپیا ختم ہوتا ہے، وہیں سے یوٹوپیا شروع ہوتا ہے، جیسے رات کے آخری لمحے میں صبح کا پہلا اجالا۔ منٹو کا "ٹھنڈا گوشت" پڑھیں، وہ انسانی بربریت کی انتہا ہے۔ مگر اس کہانی کو پڑھ کر جو کراہت محسوس ہوتی ہے، وہی کراہت دراصل یوٹوپیائی احساس ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے تھا، انسان اس سے بہتر ہو سکتا ہے۔ منٹو نے کبھی خوبصورت دنیا کا خواب نہیں دکھایا۔ مگر اس نے اتنی بدصورت حقیقت دکھائی کہ قاری خود بخود سوچنے لگتا ہے کہ بہتر دنیا کیسی ہو گی۔ یہی اُردو ادب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ یہاں یوٹوپیا کو سجا کر پیش نہیں کیا جاتا، اسے محسوس کرایا جاتا ہے، درد کے راستے سے، تکلیف کے راستے سے، آنسوؤں کے راستے سے۔

اُردو ادب میں یوٹوپیائی تخیل کی قدیم ترین اور سب سے آزاد صورت داستانوں میں نظر آتی ہے۔ چاہے وہ داستانِ امیر حمزہ ہو یا طلسمِ ہوش ربا۔ ان داستانوں میں ایسی دنیاؤں کا تصور ہے جو حقیقت سے بالکل مختلف ہیں۔ جادوئی باغ، اڑنے والے گھوڑے، طلسماتی محل، ایسی مملکتیں جہاں بہادری کو قدر ملتی ہے، جہاں محبت کو فتح ملتی ہے، جہاں ظلم کو شکست ہوتی ہے۔ یہ بچوں کی کہانیاں نہیں تھیں، یہ بڑوں کا یوٹوپیا تھا۔ ایک ایسی دنیا جو حقیقت میں نہیں تھی مگر جس کی آرزو دل میں تھی۔ داستان نے اُردو قاری کو یہ آزادی دی کہ وہ اپنی روزمرہ کی تنگ دنیا سے نکل کر ایک وسیع، خوبصورت، منصفانہ دنیا میں چند گھڑی کے لیے رہ سکے۔ داستان کا یوٹوپیا سادہ ہے، نیکی جیتتی ہے، بدی ہارتی ہے، محبت کو منزل ملتی ہے۔ یہ سادگی اس کی کمزوری نہیں، طاقت ہے۔ کیونکہ ہر انسان کے دل کی گہرائی میں یہی خواب ہے۔ اُردو ادب کے یوٹوپیائی عناصر کی بات کریں اور تصوف کا ذکر نہ ہو یہ ناممکن ہے۔ صوفیانہ شاعری نے ایک ایسے عالم کا تصور پیش کیا جو محض سیاسی یا سماجی نہ ہو، بلکہ روحانی ہو۔ ایک ایسی دنیا جہاں انسان کا اپنے خالق سے ملاپ ہو، جہاں نفس کی تمنائیں ختم ہو جائیں، اور جہاں محبت کا ایسا درجہ ہو جہاں دو کا وجود نہ رہے بلکہ صرف ایک ہی باقی رہے۔

بلھے شاہ کی شاعری میں یوٹوپیا ایک اندرونی سفر ہے۔ یعنی باہر کی دنیا کو بدلنا نہیں، بلکہ اپنے اندر کی دنیا کو بدلنا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک انسان خود کو نہیں پہچان لیتا، کوئی بھی دنیا مثالی نہیں بن سکتی۔ امیر خسرو کی شاعری میں وصل کا وہ لمحہ یوٹوپیا کا سب سے حسین استعارہ ہے۔ وہ وقت جب تمام فاصلے ختم ہو جائیں، تمام دیواریں ڈھ جائیں، اور صرف محبت ہی باقی رہے۔ صوفی شاعری نے اُردو ادب کو یہ پیغام دیا کہ یوٹوپیا صرف بیرونی نہیں ہوتا، یہ انسان کے اندر بھی ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات بیرونی دنیا کو بدلنے سے پہلے اندرونی دنیا کو بدلنا ضروری ہوتا ہے۔ اُردو ادب کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جسے عموماً نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ یعنی طنز و مزاح۔ تاہم اُردو کے طنز نگاروں نے بھی اپنے مخصوص انداز میں یوٹوپیائی سوچ کو بیان کیا ہے۔ ابن انشاء کی تحریروں میں ایک ایسا کردار نظر آتا ہے جو دنیا کی بے وقوفیوں پر ہنستا ہے۔ لیکن اس ہنسی کے پیچھے یہ تمنا ہے کہ کاش دنیا کچھ زیادہ سمجھدار ہوتی، کاش لوگ کچھ بہتر ہوتے۔ ابن انشاء کا یوٹوپیا ایک مسکراتا ہوا یوٹوپیا ہے۔ جو رونا دھونا کرنے کے بجائے، مسکراہٹ کے ذریعے ایک بہتر دنیا کی خواہش کرتا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کے ہاں طنز اتنا گہرا ہے کہ پڑھتے پڑھتے ہنسی آتی ہے اور پھر اچانک رونا آتا ہے۔ اُنھوں نے پاکستانی معاشرے کی ان کمزوریوں پر قلم اٹھایا جو ہمیں ایک بہتر معاشرہ بننے سے روکتی ہیں۔ ان کا طنز دراصل ایک دعوت ہے کہ دیکھو تم کیا ہو، اور سوچو کہ تم کیا ہو سکتے ہو۔ اُردو ڈراموں میں بھی یوٹوپائی اجزاء پائے جاتے ہیں۔ لیکن یہاں یوٹوپیا ایک عملی صورت اختیار کر لیتا ہے۔۔ اسٹیج پر جب کردار بولتے ہیں تو ان کی باتیں صرف کہانی نہیں رہتیں، وہ ایک زندہ تجربہ بن جاتی ہیں۔ آغا حشر کاشمیری کے ڈراموں میں انصاف کا وہ خواب ہے جو ہر دور میں تازہ رہتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے کرداروں کے ذریعے وہ دنیا دکھائی جہاں بُرائی کو سزا ملتی

ہے اور نیکی کو صلہ۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ حقیقت میں ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ مگر اسٹیج پر ایسا ہو سکتا ہے اور شاید اسی لیے ڈرامہ یوٹوپیا کا سب سے براہِ راست اظہار ہے۔

ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ڈراموں نے بھی اُردو یوٹوپیا کو عوام تک پہنچایا۔ اشفاق احمد کے ڈرامے ایک ایسے انسان کی تلاش تھے جو اپنی روح سے جڑا ہو، جو مادیت کی دوڑ میں اپنا آپ نہ کھوئے۔ ان کا "من چلے کا سودا" ہو یا "توتا کہانی" ہر جگہ ایک ایسے انسان کا خواب ہے جو مکمل ہو، جو اندر اور باہر سے ایک ہو۔ اُردو نثر نے بھی یوٹوپیائی سوچ کو اپنے انداز سے بیان کیا ہے اور یہاں یوٹوپیا زیادہ عملی اور زیادہ براہِ راست ہے۔ سر سید احمد خان کا یوٹوپیا تعلیم تھا۔ اُنھوں نے ایک ایسے مسلمان معاشرے کا خواب دیکھا جو جدید علوم سے آراستہ ہو، جو سائنس پڑھے، جو دنیا کے ساتھ قدم ملا کر چلے۔ علی گڑھ تحریک اس یوٹوپیا کو حقیقت میں بدلنے کی کوشش تھی۔ سر سید نے ایک خواب دیکھا اور پھر اس خواب کو ایک ادارے میں تبدیل کر دیا۔ یہ اُردو ادب کی تاریخ میں یوٹوپیا کی سب سے عملی مثالوں میں سے ایک ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا یوٹوپیا وحدت پر مبنی تھا۔ ایک ایسا ہندوستان جہاں ہندو اور مسلمان مل کر رہ سکیں، جہاں مذہبی اختلافات سیاسی دشمنی کا سبب نہ بنیں، اور جہاں تہذیبی تنوع کمزوری کے بجائے طاقت ہو۔ تاریخ نے ان کے خواب کو نہیں مانا مگر ان کے الفاظ آج بھی اس خواب کی گواہی دیتے ہیں۔

اُردو ادب میں محبت کو ہمیشہ ذاتی جذبے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ مگر گہرائی سے دیکھیں تو اُردو کا عشق ایک سیاسی بیان بھی ہے۔ جس دور میں طبقاتی نظام سخت تھا، جب اونچے گھرانے کی لڑکی اور عام گھرانے کے لڑکے کی محبت ناممکن تھی۔ تب اُردو شاعری نے یہ کہا کہ عشق میں کوئی اونچا نیچا نہیں۔ جب مذہب کی بنیاد پر نفرتیں تھیں، تب اُردو داستانوں میں مختلف مذاہب کے کردار ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ جب عورت کو چار دیواری میں بند رکھا جاتا تھا، تب اُردو کی محبوبہ آزاد تھی، اپنی مرضی سے ملتی تھی، اپنی مرضی سے ٹھکراتی تھی۔ یہ محبت حقیقت نہیں تھی، یہ یوٹوپیا تھا۔ ایک ایسی دنیا کا خواب جہاں انسان کو انسان سے ملنے کے لیے اجازت نہ لینی پڑے، جہاں دل کی بات دل تک پہنچ سکے، جہاں محبت کو سماجی زنجیریں نہ روکیں۔ **مومن خان مومن** کا وہ مشہور شعر:

تم　میرے　پاس　ہوتے　ہو　گویا
جب　کوئی　دوسرا　نہیں　ہوتا(۵)

یہ محض ایک جذباتی لمحے کا بیان نہیں۔ یہ ایک ایسی دنیا کی تمنا ہے جہاں دو انسان بغیر کسی تیسری نگاہ کے مل سکیں، جہاں پرائیویسی ہو، جہاں رشتہ باہر کی نہیں اندر کی بات ہو۔ آج کے دور میں یہ عام لگتا ہے۔ مگر جس دور میں یہ لکھا گیا، اس دور میں یہ ایک انقلابی خواب تھا۔ اُردو ادب میں تین شہر ایسے ہیں جو یوٹوپیا کی علامت بن گئے، دہلی، لکھنؤ اور لاہور۔ اُردو ادب نے ان تینوں شہروں کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ وہ صرف جغرافیائی مقامات نہیں رہے بلکہ خوابوں میں بدل گئے۔ دہلی (میر اور غالب کی دہلی) ایک ایسا شہر تھا جہاں شاعری فضاؤں میں بسی تھی، جہاں کی ہر گلی میں کوئی نہ کوئی استاد موجود تھا اور جہاں علم و ادب کی قدر کی جاتی تھی۔ اس شہر کے اجڑنے پر اُردو ادب نے اس کا نوحہ لکھا، لیکن اس نوحے میں ایک یوٹوپیائی یاد بھی شامل تھی کہ ایسا شہر ممکن ہے، یا کہیں موجود ہے۔ لکھنؤ (تہذیب، نزاکت اور آداب کا شہر) لکھنؤ کا یوٹوپیا ایک ایسے معاشرے کا تصور ہے جہاں انسان ایک دوسرے سے شائستگی سے ملیں، جہاں زبان میں مٹھاس ہو اور جہاں ثقافت کی قدر ہو۔ مرزا محمد ہادی رسوا کا ناول "امراؤ جان ادا" لکھنؤ کے اسی یوٹوپیا کی ایک المناک عکاسی ہے۔ ایک ایسی دنیا جو خوبصورت بھی تھی اور ظالم بھی، جو تہذیب کا دعویٰ تو کرتی تھی مگر عورت کو آزادی فراہم نہیں

کرتی تھی۔ لاہور (علم، شاعری، جوش اور زندگی کا شہر)۔ فیض کا لاہور، پطرس بخاری کا لاہور، صوفی تبسم کا لاہور۔ یہ سب ایک ایسے شہر کی تصویر ہیں جہاں زندگی بھرپور تھی، جہاں لوگ سوچتے تھے، لکھتے تھے، بحث کرتے تھے۔ تقسیم کے بعد یہ لاہور ایک یوٹوپیائی یاد بن گیا۔ ایک ایسا شہر جو دونوں طرف کے لوگوں کے دلوں میں الگ الگ رہتا ہے مگر دونوں کے لیے یکساں محبوب ہے۔

اُردو یوٹوپیا صرف ایک فرد کا خواب نہیں۔ یہ ایک پوری قوم، ایک پوری تہذیب کا خواب ہے۔ فیض نے جب لکھا تو لاکھوں لوگوں کی آواز لکھی۔ پروین شاکر نے جب لکھا تو ہزاروں عورتوں کا درد لکھا۔ یہی اجتماعیت اُردو یوٹوپیا کو طاقتور بناتی ہے۔ ہم ایک ایسے دور میں جی رہے ہیں جہاں یوٹوپیائی سوچ کو ناسمجھی سمجھا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں خواب دیکھنا چھوڑو، حقیقت دیکھو۔ مگر اُردو ادب ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ خواب دیکھنا کمزوری نہیں، یہ سب سے بڑی جرأت ہے۔ میر نے اجڑے ہوئے دہلی میں خواب دیکھا۔ فیض نے جیل میں خواب دیکھا۔ قرۃ العین نے تقسیم کے بعد خواب دیکھا۔ پروین شاکر نے ایک ایسے سماج میں خواب دیکھا جو عورت کی آواز سننا نہیں چاہتا تھا۔ یہ خواب ضائع نہیں گئے، یہ الفاظ بن گئے، اور الفاظ نسل در نسل سفر کرتے رہے۔

حوالہ جات

۱۔ فیض احمد فیض، میرے دل میرے مسافر، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۸۲، ص:۲۲

۲۔ میر تقی میر، کلیات میر مرتبہ عبادت بریلوی، اُردو دنیا، کراچی، ۱۹۵۸، ص:۲۹۱-۲۹۲

۳۔ علامہ اقبال، بال جبریل، کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس، لاہور، ۱۹۳۵ء، ص:۱۴۹

۴۔ مرزا غالب، دیوان غالب جدید، نسخۂ حمیدیہ، مدھیہ پردیش اُردو اکیڈمی، بھوپال، ۱۹۸۲ء، ص:۲۰۰

۵-مومن خاں مومن، کلیات مومن، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص:۶۰

References in Roman Script:

1. Fiaz Ahmed Faiz, Mere Dil Mere Musafir, Maktabah, Daniyal, Karachi,1982, p.22

2. Meer Taqi Meer, Kulliyat-e-Meer, Murattab Dr. Ibadat Brelvi Urdu Duniya, Karachi,1958, p. 291-292

3. Allama Iqbal, Bal-e-Jibreel, Kapoor Art Printing Works, Lahore 1935, p.149

4. Mirza Ghalib, Diwan-e-Ghalib-e-Jadeed (Nuskha-e-Hameediya), Madhya Pradesh Urdu Academy, Bhopal,1982, p.200

5. Momin Khan Momin, Kulliyat-e-Momin , Majlis Taraqqi Adab, Lahore,1964, p.60